”ٹیکس: سہولیات کا حصول یا دشوار زندگی“

مقررین: محمد رضا ۔ عارف حسن



اربن ریسورس سینٹر

اکتوبر 2026ء

URC

F-144-72

ٹرانسکرپشن:

کشف ناصر

ادارت:

بلقیس، سیما لیاقت

عکاسی:

شکیل یونس

''ٹیکس: سہولیات کا حصول یا دشوار زندگی''

کے عنوان سے یہ فورم 29 ستمبر 2026 کو یو آر سی میں منعقد ہوا۔

یو آر سی رابطے کے لئے:

فون نمبر: 021-34387692

ای میل: urckhi@yahoo.com

ویب سائٹ: www.urckarachi.org

ٹیکس: سہولیات کا حصول یا دشوار زندگی

مقررین:

جناب محمد رضا — ماہرِ معاشیات FCA (پاکستان) ACA (لندن)

جناب عارف حسن — چیئرمین۔ اربن ریسورس سینٹر

29 ستمبر 2026

اربن ریسورس سینٹر

A-2 دوسری منزل ویسٹ لینڈ ٹریڈ سینٹر، کمرشل ایریا،
شہید ملت روڈ، کراچی، پاکستان

021-34387692
urckhi@yahoo.com
www.urckarachi.org
fb.com/urckhi
@urckhi

مقررین کا تعارف

محمد رضا، اے ایف فرگوسن اینڈ کمپنی (PwC نیٹ ورک کی ممبر فرم) میں ٹیکسیشن سروسز کے پارٹنر ہیں اور جولائی 2011 سے اس عہدے پر فائز ہیں۔ پارٹنر بننے سے قبل وہ اگست 2003 سے فرم میں مختلف مینیجریل عہدوں پر خدمات انجام دے چکے ہیں۔ ان کے پاس ملکی و بین الاقوامی اداروں اور اعلیٰ مالیاتی حیثیت کے حامل افراد (High-Net-Worth Individuals) کو ٹیکس مشاورت، ایڈوائزری، کمپلائنس اور اپیلٹ سروسز فراہم کرنے کا تقریباً 24 سال کا وسیع تجربہ ہے۔ تعلیمی و پیشہ ورانہ اعتبار سے وہ انسٹی ٹیوٹ آف چارٹرڈ اکاؤنٹنٹس آف پاکستان کے فیلو ممبر (FCA) اور انسٹی ٹیوٹ آف چارٹرڈ اکاؤنٹنٹس آف انگلینڈ اینڈ ویلز کے ایسوسی ایٹ ممبر (ACA) ہیں۔ اس کے علاوہ وہ چارٹرڈ انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکسیشن (برطانیہ) سے انٹرنیشنل ٹیکس ایفیلی ایٹ، ڈپلومہ ان ٹیکس ٹیکنالوجی (DITT) اور انٹرنیشنل ٹیکسیشن وٹرانسفر پرائسنگ کے سرٹیفکیٹس حاصل کر چکے ہیں۔ انہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی (Department for Continuing Education) سے 'Political Economy of Taxation' کا کورس بھی مکمل کیا ہے۔ محمد رضا پاکستان اور بین الاقوامی ٹیکسیشن سے متعلق مختلف سیمینارز، ورکشاپس اور ٹریننگ سیشنز کے باقاعدہ سپیکر ہیں۔ وہ پرنٹ اور ڈیجیٹل میڈیا میں مضامین تحریر کرنے کے ساتھ ساتھ منصور رضا کے ساتھ 'Options for Pro-Poor Taxation Policy in Pakistan' کے عنوان سے تحقیقی مقالہ تحریر کر چکے ہیں اور سید شبر زیدی کی

کتاب 'Taxation of Non-Residents in Pakistan' کی تحریر میں معاونت فراہم کر چکے ہیں۔

☆-------☆-------☆

عارف حسن، پاکستان کے ممتاز ماہرِ تعمیرات، شہری منصوبہ ساز، محقق اور مصنف ہیں۔ انہوں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کراچی اور پاکستان کے شہری مسائل، کم آمدنی والے طبقات کی رہائش، کچی آبادیوں کی ترقی اور شہری منصوبہ بندی کے سماجی پہلوؤں پر تحقیق اور عملی کام کے لیے وقف کی ہے۔ وہ اربن ریسورس سینٹر (URC)، کراچی کے بانی اور چیئرپرسن ہیں اور شہری ترقی کے عمل میں مقامی آبادیوں کی شمولیت، عوامی ضروریات اور سماجی انصاف کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی تحقیق اور تحریری کام نے پاکستان میں شہری مسائل کو سمجھنے اور ان کے حل کے لیے کمیونٹی پر مبنی طریقۂ کار کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ شہری منصوبہ بندی اور سماجی ترقی کے میدان میں ان کی خدمات کو قومی اور بین الاقوامی سطح پر تسلیم کیا گیا ہے۔ انہیں ہلالِ امتیاز سمیت متعدد اعزازات سے نوازا جا چکا ہے۔

☆-------☆-------☆

زاہد فاروق: ارین ریسورس سینٹر میں، میں آپ تمام افراد کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ آج کے فورم کا موضوع ٹیکس سہولت کا حصول یا دشوار زندگی ہے۔ حکومت عوام سے ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز پر ٹیکس وصول کرتی ہے۔ ہم میں سے بہت لوگ یہ نہیں جانتے کہ ٹیکس کیا ہے اور حکومت ہر چیز پر ہم سے کتنا ٹیکس وصول کرتی ہے۔ اس حوالے سے گفتگو کرنے کے لیے آج ہمارے ساتھ ماہر معاشیات جناب محمد رضا صاحب موجود ہیں۔ آپ نے پاکستان سے ایف سی جبکہ لندن سے اے سی اے کی ڈگری حاصل کی۔ رضا صاحب ٹیکس کے نظام کو بہت قریب سے دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔ آپ نے مختلف عالمی اداروں کے ساتھ کام کیا اور ٹیکس کے حوالے سے کتابیں بھی لکھی ہیں۔ یہ کتابیں ٹیکس، اس کے استعمال، جمع کرنے کے طریقوں کے حوالے سے لوگوں کی رہنمائی کرتی ہیں۔ آپ نے کئی معاشی پالیسیز میں حکومت کی معاونت بھی کی اس کے علاوہ آپ ایک استاد بھی ہیں۔ آج کے پینل میں سول سوسائٹی سے تعلق رکھنے والی انتہائی محترم شخصیت چیئرمین ارین ریسورس سینٹر جناب عارف حسن صاحب بھی تشریف فرما ہیں۔ جن کا شہری ترقی کی دنیا میں ایک بہت بڑا نام ہے۔ عارف صاحب ایک نامور آرکیٹیکٹ، علاقائی منصوبہ ساز (TOWN PLANNER) اور معلم ہیں۔ میں محترم جناب رضا صاحب کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ موضوع کے اعتبار سے گفتگو کریں اور ہمیں بتائیں کہ حکومت ہم سے کس طرح ٹیکس لیتی ہے اور اس ٹیکس کو کہاں استعمال کیا جاتا ہے۔

محمد رضا: زاہد صاحب! آپ کا بہت شکریہ۔ میں اربن ریسورس سینٹر کا بھی بہت مشکور ہوں۔ عارف حسن صاحب کے ساتھ پینل پر بیٹھنا ایک اعزاز کی بات ہے۔ آپ تمام لوگ وسیع نظر رکھتے ہیں۔ آپ کے سامنے گفتگو کرنا میرے لیے باعث فخر ہے۔ شعبہ ٹیکس سے میری 25 سالہ وابستگی ہے۔ اسلئے آپ لوگ مجھے ٹیکس مشیر کہہ سکتے ہیں۔ میں لوگوں کو مشورے دیتا ہوں کہ وہ اپنے ٹیکس کی ذمہ داریاں کس طرح نبھائیں۔ اس کے علاوہ حکومت کے ساتھ بھی کسی نہ کسی منصوبے یا پالیسی کے حوالے سے معاونت جاری رہتی ہے۔ جس میں ہم ٹیکس پالیسی کو بہتر بنانے کے حوالے سے بات کرتے ہیں۔ آج کے فورم کا موضوع بہت اہم ہے۔ ہم دیکھیں گے کہ ٹیکس سہولت کا حصول ہے یا اس کے ذریعے زندگی کی دشواریوں میں مزید اضافہ کیا جاتا ہے۔ میں نے اس حوالے سے ایک پریزنٹیشن تیار کی ہے۔ کسی بھی ٹیکس دہندہ سے ریاست کی توقع ہوتی ہے کہ وہ ٹیکس کی مد میں ریاست کو پیسے دے گا۔ جب کوئی ٹیکس لگایا جاتا ہے تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ کیا اس شخص کی اتنی استطاعت ہے کہ وہ یہ رقم ادا کر سکے۔ کوشش یہ ہوتی ہے کہ جو ٹیکس لیا جا رہا ہے وہ اس شخص کی استطاعت کے مطابق ہو اس سے زیادہ نہ ہو۔ دوسری اہم چیز یہ ہے کہ معاشرے کے جن اداروں کے لیے یہ ٹیکس لیا جاتا ہے ان کے اندر احتسابی عمل ہونا چاہیے۔ جو ٹیکس دہندہ ہیں کیا انہیں اداروں سے سوال کرنے کا اختیار ہے کہ جو ٹیکس کی رقم وہ ادا کر رہے ہیں وہ صحیح طور پر استعمال ہو رہی یا نہیں۔ تیسری چیز یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ حکومت عوام سے جو سہولیات دینے کا وعدہ کرتی ہے کیا وہ اس پر مکمل طریقے سے عمل کرتی ہے یا نہیں۔ میں نے اپنی گفتگو کو تین حصوں

میں تقسیم کیا ہے۔ سب سے پہلے حصے میں ٹیکس دہندہ کے حوالے سے گفتگو کروں گا کہ ٹیکس کون ادا کرتا ہے، کتنا ٹیکس ادا کرتا ہے اور حکومت نے جو بوجھ ٹیکس دہندہ پر ڈالا ہوا ہے کیا وہ اس کی استطاعت کے مطابق ہے یا اس سے زیادہ ہے۔ دوسرے حصے میں ہم دیکھیں گے کہ ٹیکس کے پیسے کہاں اور کیسے خرچ ہوتے ہیں اور ان پیسوں کو خرچ کرنے کی ذمہ داری کن اداروں کی ہے۔ تیسرے حصے میں ہم گفتگو کریں گے کہ شہری ریاست سے جن بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کی توقعات رکھتے ہیں یا وہ بنیادی حقوق جو آئین میں شامل ہیں کیا ریاست اس کو پورا کر پا رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ شہری اور ریاست کے درمیان اعتماد کا توازن اتنا بگڑا ہوا کیوں ہے؟ اگر عوام ٹیکس دے بھی رہی ہے تو اس کو یہ توقع نہیں ہے کہ اس پر یہ رقم خرچ ہوگی اور جو ٹیکس ادا نہیں کر رہا اس کی خواہش ہے کہ وہ ٹیکس نہ ہی دے کیونکہ حکومت کی جانب سے اسے کوئی سہولت نہیں مل رہی۔ میرا آپ تمام لوگوں سے بنیادی سوال ہے کہ آپ میں سے کتنے لوگوں نے آج ٹیکس ادا کیا ہے۔ آپ تمام افراد کے پاس موبائل فون ہوگا جس پر ایف بی آر کے اکثر پیغامات موصول ہوتے ہیں کہ آپ لوگ ٹیکس ریٹرن فائل کریں۔ انکم ٹیکس کی ریٹرن داخل کرنا اور ٹیکس کے بوجھ کو برداشت کرنا یہ دو الگ چیزیں ہیں۔ ریاستی اداروں کی جانب سے یہ تصور قائم کر دیا گیا ہے کہ پاکستان میں بہت کم لوگ ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ میں آپ کو بتا دوں وہ لوگ کم نہیں جو ٹیکس ادا کرتے ہیں بلکہ انکم ٹیکس کے گوشوارے داخل کروانے والے لوگ کم ہیں۔ اگر میں ٹیکس کی رقم کے حوالے سے بات کروں تو ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کے اوپر ٹیکس ہے اگر آپ موبائل استعمال

کرتے ہیں تو اس پر ٹیکس ہے۔ موبائل چارج کرنے کے لیے بجلی استعمال کرتے ہیں تو اس کے بلوں میں بھی ٹیکس موجود ہوتا ہے۔ اگر آپ ٹرانسپورٹ کا استعمال کرتے ہیں جس کی وجہ سے پیٹرول خرچ ہوتا ہے اس پیٹرول پر بھی ٹیکس لگتا ہے۔ جسے پیٹرولیم لیوی کہا جاتا ہے۔ آپ یوں سمجھیں کہ زندگی کا کوئی خانہ خالی نہیں ہے جس کے اندر ٹیکس کا عمل دخل نہ ہو۔ معاشی اصطلاح میں ٹیکس دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ بالواسطہ (direct) اور بلاواسطہ (indirect) ٹیکس۔ ہماری ریاست کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس کا زیادہ انحصار بلاواسطہ ٹیکس کے اوپر ہے۔ ہر ٹرانزیکشن، ہر اس جگہ جہاں آپ پیسے خرچ کرتے ہیں وہاں کسی نہ کسی صورت ٹیکس لاگو کر دیا جاتا ہے۔ بظاہر آپ دکاندار سے چیز خریدتے ہیں لیکن اس کا ایک حصہ حکومت کے پاس بھی جاتا ہے۔ بالواسطہ ٹیکس جسے انکم ٹیکس ریٹرن کہا جاتا ہے یہ وہ ٹیکس ہے جو آپ کی آمدن اور بچت کے اوپر لاگو کیا جاتا ہے اور سال کے آخر میں ٹیکس کی مد میں ایک مخصوص رقم کاٹ لی جاتی ہے۔ اگر آپ اپنے روزمرہ کے معمولات پر نظر ڈالیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ آپ ہر منٹ، ہر گھنٹے، کسی نہ کسی چیز کے اوپر ٹیکس ادا کر رہے ہیں۔ یہاں سب سے بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی بھی معاشرے کو ٹیکس جمع کرنے کی ضرورت کیوں پیش کیوں آتی ہے۔ میں آپ کو بتادوں کہ ٹیکس کی تاریخ بھی اتنی ہی پرانی ہے جتنی پرانی ہماری تہذیب ہے۔ راوی کے کنارے سے برآمد ہونے والے آثاروں میں بھی ٹیکس کے حوالے سے کچھ چیزیں ملی تھیں۔ ہر دور میں ٹیکس کی مختلف اشکال ہوتی تھیں۔ ٹیکس ریاست کی ضرورت ہے لیکن پھر اس ریاست کی ذمہ داری ہے کہ

اسے اپنے سماج اور عوام کو ایسی سہولیات مہیا کرنی ہوتی ہیں جو شاید کوئی عام آدمی اکیلے حاصل نہ کر سکے۔

مثال کے طور پر شاید آپ میں سے بہت سارے لوگ فلیٹس میں رہتے ہوں۔ اکثر فلیٹس میں ریزیڈنٹ ویلفیئر ایسوسی ایشن ہوتی ہے۔کہیں یہ ادارہ بہت اچھا کام کرتا ہے کہیں برا کام کرتا ہے لیکن ان ایسوسی ایشنز کی بنیاد یہی ہوتی ہے کہ کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو ایک رہائشی کیلئے اکیلے کرنا بہت مشکل ہوتا ہے وہ ان مسائل کو حل کرنے میں مدد فراہم کرتی ہیں۔میں جن فلیٹس میں رہتا ہوں وہاں لفٹ موجود ہے۔اگر میں یہ کہہ دوں کہ ہر آدمی اس لفٹ کیلئے استعمال کے مطابق پیسے دے گا تو شاید اس کو اس طرح سے جاری رکھنا مشکل ہو جائے۔پرانے زمانے میں قصبے اور گاؤں ہوا کرتے تھے بعد میں شہر اور ریاستیں بھی انہی بنیادوں پر بنائی گئیں۔شہر اور بڑی ریاستیں وہاں معرض وجود میں آتی ہیں جہاں وہ لوگ آپس میں لین دین کر رہے ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کو نہیں جانتے۔ایسے علاقوں میں ریاستی اداروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ان اداروں کو چلانے کیلئے پیسے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ پیسہ ٹیکس کی مد میں عوام سے وصول کیا جاتا ہے۔بہت ساری سہولیات ایسی ہیں جو نظر آتی ہیں جبکہ کچھ چیزیں ایسی ہیں جو ہمیں نظر نہیں آتیں لیکن وہ ریاست کی ذمہ داری ہوتی ہیں لیکن جب ریاست ان چیزوں پر کام نہیں کرتی تو ہمیں ریاست کی عدم موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ہم تمام لوگوں نے کراچی کا بدترین دور دیکھا ہے۔ہم سب جانتے ہیں کہ اگر کسی شہر میں لاقانونیت ہو، ریاست امن و امان قائم کرنے میں ناکام ہو جائے تو نظر آتا ہے کہ

ریاست یہاں کام نہیں کر رہی۔ ریاست کی بنیادی طور پر دو طرح کی ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ ایک ذمہ داری وہ ہوتی ہے جو بظاہر نظر آتی ہے۔ جس میں سڑکیں، نکاسی آب کا نظام اور دیگر ترقیاتی کام شامل ہیں۔ دوسری وہ ذمہ داریاں ہیں جیسے عدالتی اور دیگر ریاستی نظام جن سے آپ کا روزمرہ زندگی میں واسطہ نہیں پڑتا لیکن اگر کبھی آپ کا واسطہ پڑے تو آپ کو یہ یقین ہونا چاہیے کہ اگر میں اس ریاستی ادارے کے پاس جاؤں گا وہاں قانون کے مطابق مدد فراہم کی جائے گی۔ اس سب میں سب سے اہم یہ چیز سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ریاست ٹیکس لینے کے استحقاق کا مظاہرہ صرف اس صورت میں کر سکتی ہے جب وہ اپنی تمام تر ذمہ داریوں کو نبھا رہی ہو اور ہر شہری کو یہ محسوس ہو کہ استطاعت کے مطابق ٹیکس وصول کیا جا رہا ہے اور اس ٹیکس کی رقم کا بوجھ غیر متوازن نہیں ہے۔ معیشت کی اصطلاح میں سے equity کہا جاتا ہے۔ اس کی دو اقسام ہیں horizontal equity۔ کا مطلب ہے کہ اگر ایک معاشرے میں دو لوگ ہیں اور دونوں کی آمدن برابر ہے تو ان دونوں پر ایک جتنا ہی ٹیکس ہونا چاہیے۔ vertical equity میں غیر منصفانہ طریقے سے ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں ٹیکس کا جو نظام رائج ہے اس میں سیلری پرسن، بزنس مین اور سسٹم سے باہر سب کیلئے الگ الگ ٹیکس وصولی کا نظام ہے۔ بظاہر ان تینوں کی معاشی حالت ایک جیسی ہے لیکن تینوں سے ٹیکس مختلف طریقے سے وصول کیا جاتا ہے۔ کسی سے زیادہ تو کسی سے کم ٹیکس لیا جاتا ہے۔ اس لیے اس کو غیر منصفانہ نظام کہا جاتا ہے کیونکہ آپ اس میں ہر آدمی سے اس کی معاشی حالت کے اعتبار سے نہیں بلکہ اس کے پیشے یا کام کی

نوعیت کے حوالے سے ٹیکس لیتے ہیں۔ ماہ ستمبر میں بہت سارے لوگوں کو انکم ٹیکس ریٹرن کے گوشوارے داخل کرنے ہوں گے۔ ٹیکس ریٹرن جمع کروانے میں جو مشکلات پیش آتی ہیں اور جو سلوک آپ سے رکھا جاتا ہے ان تمام تر چیزوں سے بچنے کیلئے لوگ نہیں چاہتے کہ وہ ٹیکس نیٹ کے اندر آئیں۔ میں نے 2003 میں انکم ٹیکس گوشوارے جمع کروائے تھے۔ جس میں ڈھائی سو روپے کا ریفنڈ تھا۔ اس وقت نظام کافی بہتر تھا اور میرا ڈھائی سو روپے کا چیک میرے گھر آ گیا تھا۔ اگر آج میں کسی کو یہ بتاؤں تو اس کے لیے یہ بہت اچھنبے کی بات ہوگی کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے لیکن درحقیقت ایک ایسا زمانہ گزرا ہے۔ آج کے زمانے میں اگر کوئی شخص انکم ٹیکس ریٹرن داخل کرنا شروع کرتا ہے تو اس پر نوٹسز کی بھرمار ہو جاتی ہے اور جو سوال اس سے پوچھے جاتے ہیں تو وہ سوچتا ہے کہ اس سے بہتر تھا کہ میں نیٹ میں نہیں آتا۔ یہ وہ وجوہات ہوتی ہیں جس کی وجہ سے آپ کے اوپر مختلف اقسام کے بوجھ ہوتے ہیں اور اس سے سوالات جنم لیتے ہیں اور ٹیکس ادائیگی متاثر ہوتی ہے۔ جب آپ حکومت کو ٹیکس ادا کرتے ہیں تو آپ توقع کرتے ہیں کہ اس کے بدلے میں ریاست آپ کو تعلیم اور صحت جیسی بنیادی سہولیات فراہم کرے گی لیکن اگر لوگوں کو ٹیکس ادا کرنے کے باوجود ان تمام تر چیزوں پر بھی الگ سے پیسہ خرچ کرنا پڑے تو یہ سوچ پروان چڑھتی ہے کہ بہتر ہے ہم ٹیکس ادا نہ کریں۔ ہم تمام لوگ ٹیکس دہندگان ہیں بے شک ہم میں سے بہت سے لوگ انکم ٹیکس ریٹرن داخل نہ کرتے ہوں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ سالانہ آمدن اس سطح سے اوپر نہ ہو جس پر ٹیکس لاگو ہوتا ہے لیکن ہم تمام لوگ کسی نہ کسی

طرح سے ٹیکس میں حصہ ڈال رہے ہیں۔ اگر میں کراچی کی مثال ہوں تو روزمرہ زندگی کی تمام بنیادی سہولیات کے لیے مجھے پیسے خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ اگر مجھے پانی چاہیے تو مجھے ٹینکر خریدنا پڑتا ہے۔ بجلی نہ ہونے کی صورت میں جنریٹر اور سولر کا استعمال کیا جاتا ہے۔ بہت ساری جگہیں ایسی ہیں جہاں امن و امان کی صورتحال خراب ہے اور عدم تحفظ کی وجہ سے آپ کو سیکیورٹی اہلکار کرائے پر لینے پڑتے ہیں۔ گلیوں کی حفاظت کیلئے چوکیدار رکھنے پڑتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں ریاستی امن و امان کے نظام پر اعتماد نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کراچی میں رہنے والے ہر شخص کو یہ ٹیکس دو بار ادا کرنا پڑتا ہے ایک دفعہ وہ ریاست کو ٹیکس کی مد میں یہ رقم دیتا ہے جبکہ دوسری طرف وہ بنیادی ضروریات جن کا وعدہ ریاست نے ہر شہری کے ساتھ کیا ہے وہ اس کو فراہم نہیں کر پا رہی۔ جس کی وجہ سے شہریوں کو وہ سہولیات خرید کر استعمال کرنی پڑتی ہیں۔ حکومت کی جانب سے کچھ سہولیات میسر ہیں مثال کے طور پر سرکاری اسکول، سرکاری اسپتال لیکن اس میں بھی دو چیزیں دیکھنے میں آتی ہیں کہ یا تو وہ ناکافی ہیں یا علاقے میں موجود نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ ایک عام تاثر یہ ہے کہ ان سرکاری سہولیات کا معیار اچھا نہیں ہے اس لیے اگر مجھے اچھی صحت کی سہولیات یا تعلیم حاصل کرنی ہے تو مجھے لامحالہ پرائیویٹ اداروں کا رخ کرنا پڑتا ہے۔ اگر شہری ٹیکس کی رقم ادا کر رہا ہے تو پھر وہ سوال کرتا ہے کہ اگر ریاست مجھے سہولیات فراہم کرنے میں ناکام ہے تو میرے ٹیکس کا پیسہ کہاں جاتا ہے۔ ہمارا وفاقی حکومت کا جو ڈھانچہ ہے اس کی ایک فیڈریشن ہے جسے وفاقی حکومت چلاتی ہے۔ اس کے بعد صوبائی حکومتیں ہیں۔ ان کے درمیان قومی

مالیاتی کمیشن فارمولا کے تحت ٹیکس کی رقم تقسیم کی جاتی ہے۔ یہ فارمولا 18 ویں ترمیم کے وقت بنا تھا جو آج تک رائج ہے۔ اس کے تحت اگر کوئی شہری 100 روپے ٹیکس دیتا ہے تو اس میں سے 58 روپے صوبوں میں تقسیم کر دیے جاتے ہیں۔ اگر میں سندھ کی بات کروں تو اس 100 روپے میں سے ساڑھے 14 روپے سندھ حکومت کے پاس آتے ہیں اور ان ساڑھے 14 روپے کو صوبائی حکومت اپنی ترجیحات کے لحاظ سے خرچ کرتی ہے۔ اگر میں وفاقی حکومت کی بات کروں تو اس کا سب سے بڑا خرچہ شرح سود ہے۔ ہمارے پاس ٹیکس اور دیگر وسائل سے کبھی اتنے پیسے جمع ہی نہیں ہو پاتے جس کے ذریعے ہم اپنے تمام ریاستی اخراجات پورے کر سکیں۔ جس کی وجہ سے حکومت کو ہر بار قرضہ لینا پڑتا ہے اور یہ مختلف قسم کے قرضے ہوتے ہیں۔ حالیہ بجٹ میں حکومت نے بتایا کہ پاکستان پر 83 ٹریلین روپے کا قرضہ ہے جس میں سے 60 فیصد لوکل جبکہ 40 فیصد بین الاقوامی قرضہ ہے جس میں آئی ایم ایف بھی شامل ہے۔ جب آپ ادھار لیتے ہیں تو اس پر آپ کو سود ادا کرنا پڑتا ہے۔ ہر سال شرح سود اتنا زیادہ ہوتی ہے کہ ٹیکس کی رقم کی تقسیم کے بعد وفاق کے پاس جتنے پیسے بچتے ہیں وہ تمام کے تمام شرح سود میں خرچ ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد دفاع، سول بیوروکریسی، پی ایس جی پی یا عوامی فلاح کے حوالے سے وفاق کی ذمہ داریاں ادھار سے چلتی ہیں وہ رقم بھی شہری ٹیکس کی مد میں ادا کرتے ہیں۔ وفاقی حکومت کے پاس ٹیکس کی رقم انکم ٹیکس اور سیلز ٹیکس کی مد میں آتی ہے۔ سیلز ٹیکس کے دو حصے ہوتے ہیں۔ کچھ سیلز ٹیکس چیزوں کے اوپر ہوتا ہے وہ رقم حکومت کے پاس جاتی ہے کچھ سیلز ٹیکس ٹیلی کام،

انٹرنیٹ ،ریسٹورنٹ جیسی سروسز پر ہوتا جس کی رقم صوبائی حکومت کے پاس جاتی ہے۔جو رقم صوبائی حکومت کے پاس آتی ہے تو ان کے پاس مکمل اختیار ہوتا ہے کہ وہ اس رقم کو کس طرح خرچ کریں۔وفاق کے پاس جو پیسہ جاتا ہے وہ مختلف ڈویژنز میں تقسیم ہوتا ہے۔ہم کراچی کے شہری ہیں ہمیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جو ٹیکس میں ادا کرتا ہوں وہ مجھ تک کس طرح پہنچتا ہے۔اگر ہم بات کریں کہ کراچی تک کتنی رقم پہنچتی ہے تو یہ ٹیکس تین طریقوں سے کراچی میں خرچ ہوتا ہے۔سب سے پہلے صوبائی حکومت طے کرتی ہے کہ اسے صحت،تعلیم اور امن و امان کی صورتحال پر کتنا ٹیکس کا پیسہ خرچ کرنا ہے۔اس میں سے کچھ حصہ کراچی کو بھی ملتا ہے اس حوالے سے کسی قسم کے سرکاری اعداد و شمار موجود نہیں ہیں۔دوسرے طریقے میں خصوصی طور پر منصوبہ بندی کی جاتی ہے۔مثال کے طور پر کراچی کے لیے ترقیاتی بجٹ مخصوص کیا جاتا ہے۔کچھ منصوبوں پر وفاقی حکومت کام کرتی ہے جس طرح گرین بس کا منصوبہ ہے۔تیسرے طریقہ وہ ہے جو خالصتا کراچی پر خرچ ہوتا ہے۔یہ وہ پیسہ ہے جو ہمارے ٹاؤن کاؤنسل یا کے ایم سی کے پاس آتا ہے جو صوبائی حکومت مہیا کرتی ہے۔جب کہ کچھ جگہوں پر انہیں خود سے بھی ٹیکسز اور آمدنی کرنے کے اختیارات ہوتے ہیں جو سندھ میں نسبتا کم ہیں۔اگر ہم لاہور ڈیولپمنٹ اتھارٹی کی مثال لیں تو ان کے پاس ایک مکمل زمین ہے جہاں سے وہ پیسہ کماتے ہیں اور وہ پیسہ لاہور پر خرچ ہوتا ہے۔اس میں سے کچھ زمین ریلوے کے پاس ہے، کچھ ڈی ایچ اے کے پاس ہے لیکن کے ایم سی کے پاس ایسی کوئی زمین موجود نہیں ہے اس وجہ سے وہ کوئی پیسے نہیں بنا پاتے۔ان کا بھی تمام انحصار اس ٹیکس

کے پیسے پر ہوتا ہے جو وفاق کے ذریعے ان کو دیا جاتا ہے۔ کراچی میں اتنے زیادہ ادارے ہیں کہ عام طور پر شہری کو یہ سمجھ نہیں آتا کہ مجھے اپنے مسئلے کے حل کے لیے کس سے بات کرنی ہے اور جو ٹیکس میں ادا کرتا ہوں وہ اس تک کتنا پہنچتا ہے۔ یہ کچھ بنیادی مسائل ہیں جس کی وجہ سے ہمارے معاشرے کے اندر یہ بات بہت زیادہ چرچا میں رہتی ہے کہ کراچی میں ٹیکس کی منصفانہ ترسیل اور تقسیم نہیں ہو رہی۔ اگر میں پاکستان کی بات کروں تو ہر علاقے کے اپنے مختلف مسائل ہیں جو بہت پسماندہ یا دیہی علاقے ہیں وہاں کی بنیادی ضروریات مختلف ہوتی ہیں جبکہ شہری علاقوں کی ضروریات مختلف ہوتی ہیں۔ ان ترجیحات کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر پیسہ وہاں خرچ نہیں ہو رہا تو آپ کو ہمیشہ ریاست سے شکوہ رہتا ہے کہ جب میرے اوپر اس طرح سے پیسے خرچ نہیں ہو رہے تو میں ٹیکس کیوں ادا کروں۔ جان رولز کی ایک بہت مشہور کتاب ہے جس میں انصاف کے حوالے سے ایک فلسفہ ہے اس کے مطابق اگر کسی معاشرے میں ایک انسان کو یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کس گھر میں پیدا ہوگا، اس کے پاس کیا مواقع میسر ہوں گے اور اس کو یہ بھی معلوم نہ ہو کہ کل کو میں تعلیم حاصل کر سکوں گا یا نہیں تو اس کی بنیادی ضروریات کیا ہونی چاہئیں۔ انہی بنیادی ضروریات کو مدنظر رکھ کر ریاست یہ طے کرتی ہے کہ وہاں کے شہری کے بنیادی حقوق کیا ہیں۔ اس کو کم از کم تعلیم، صحت اور بنیادی ضروریات ملنی چاہئیں لیکن اگر ہم عدل کی بات کریں تو پاکستان کے اندر مختلف شہر ہیں کسی شہر کا انفراسٹرکچر بظاہر بہت اچھا لگتا ہے جبکہ کسی کا بہت خراب ہوتا ہے۔ کہیں بنیادی ضروریات بہتر ہوتی ہیں کہیں بہتر نہیں ہوتیں۔ یہ کسی معاشرے یا ریاست کے

لیے اچھی چیز نہیں کہ آپ ان سہولیات کے حساب سے اپنے رہنے کی جگہ کا تعین کریں۔ ایک زمانے میں لوگ کراچی میں رہنے کو ترجیح دیتے تھے لیکن اب لوگ دوسرے شہروں میں چلے جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہاں زیادہ پرسکون ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ نہیں ہونا چاہیے۔ کراچی میں لوگوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے کیونکہ یہاں بہت برے حالات کے باوجود بھی معاشی مواقع میسر ہوتے ہیں۔ جب ریاست ناانصافی کرنے لگے اور کچھ جگہوں پر آپ کی ترجیحات مختلف ہوں وہاں آپ زیادہ رقم خرچ کر رہے ہوں اور کہیں آپ کم خرچ کرتے ہوں تو ٹیکس کنندگان کے دل میں یہ سوال لازمی پیدا ہوتا ہے کہ جو متوازن عدل ہے وہ کہاں ہے۔

بنیادی طور پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ آپ ٹیکس کی رقم کسی بھی چیز پر خرچ کر لیں لیکن اصل میں کسی بھی معاشرے یا ریاست کی کامیابی یا جیت اسی صورت نظر آتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں کی عوام کا ارتقاء کس حد تک ہوا ہے۔ اگر ان کا ارتقاء نہیں ہو رہا وہ کوئی ہنر حاصل نہیں کر رہے اور ان کی عام زندگی بہتر نہیں ہو رہی تو یہ تمام چیزیں بے کار ہو جاتی ہیں۔ اگر ٹیکس عوام کی زندگی میں تبدیلی نہیں لا رہا تو وہ نظام دشواریوں میں اضافہ کرتا ہے اور سہولیات کا فقدان ہو جاتا ہے۔ ارباب اختیار و اقتدار کو ٹیکس نظام کے اندر بہتری لانے کی ضرورت ہے۔ جو بھی پارٹی حکومت میں آتی ہے وہ صرف اپنے پانچ سالہ اقتدار کے حوالے سے سوچتی ہے جبکہ ملک کو مستقل بنیادوں پر بہتری کی ضرورت ہے۔ اگر ہمیں اپنے ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنا ہے تو ہمیں اس کی نسلوں کے بارے میں سوچ کر دیرینہ فیصلے کرنے پڑیں گے۔ اگر آپ ٹیکس کا نظام

بہتر کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے عوام کو سہولیات دینا پڑیں گی اور اس حوالے سے سوچنا پڑے گا۔شہریوں کو کم از کم بہتر تعلیم اور صحت کی سہولیات ملنی چاہیے لیکن افسوس کہ ہمارے ملک میں یہ صورتحال ہے کہ اگر آپ کے پاس پیسہ ہے تو آپ بہتر چیزیں حاصل کر سکتے ہیں لیکن اگر آپ کے پاس پیسہ نہیں ہے تو آپ کچھ حاصل نہیں کر سکتے۔ آخر میں، میں یہ کہنا چاہوں گا کہ ٹیکسیشن کے نظام کو متوازن اور عدل پسند بنایا جائے۔ ہر آدمی سے اس کی استطاعت کے مطابق ٹیکس وصول کیا جائے اور وہ تمام ادارے جن سے ہمارا روزمرہ کا تعلق ہے جب ٹیکس کی رقم ان کے پاس پہنچتی ہے تو عوام کو یہ حق ہو حاصل ہو کہ وہ ان کا احتساب کر سکیں اور سوالات اٹھا سکیں۔ ان چیزوں کو صرف سیاسی طور پر حل کرنے سے مسائل مکمل طور پر حل نہیں ہوں گے بلکہ معاشی طور پر بھی اس میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ملک میں این ایف سی ضرور ہوا ہے لیکن اس حوالے سے کوئی کام نظر نہیں آتا۔ یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ صوبائی حکومتیں ٹیکس کے پیسے کو کس طرح سے خرچ کرتی ہیں۔ 2007 کا پی ایف سی آج تک چل رہا ہے۔ عام شہریوں کا ریاست کے چند اداروں سے کبھی کبھی واسطہ پڑتا ہے جیسے عدالت اور پولیس وغیرہ لیکن روزمرہ کی ضروریات زندگی کے اندر ہم جو بھی سہولیات حاصل کرتے ہیں اس پر سیلز ٹیکس لگایا جاتا ہے۔ چاہے آپ 100 روپے کمائیں یا لاکھ روپے ہر شخص کو کوئی بھی چیز خریدنے پر ایک جیسا سیلز ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے۔ ہر 100 روپے کی چیز خریدنے پر آپ کو ساڑھے پندرہ روپے سیلز ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے۔ اگر آپ کی چھ لاکھ سے کم آمدنی ہے تو بظاہر آپ پر سیلز ٹیکس لاگو نہیں ہوتا لیکن ہر آدمی اپنی کمائی کا

ساڑھے پندرہ فیصد ٹیکس کی مد میں دیتا ہے۔ اس وجہ سے یہ نظام متوازن نہیں سمجھا جاتا۔ دنیا بھر میں بلاواسطہ ٹیکس کو رجعت پسند سمجھا جاتا ہے۔۔اس سے سب سے زیادہ متاثر کم آمدنی والا طبقہ ہوتا ہے کیونکہ کم آمدنی والے طبقے کو اپنی تمام رقم خرچ کرنی پڑتی ہے اور اس میں سے 15 سے 18 فیصد ٹیکس کی صورت میں ادا کرنا پڑتا ہے۔لیکن اگر کوئی شخص امیر ہے تو وہ اس سے اپنی بچت بھی کرسکتا ہے۔ اگر آپ اس نظام کو بہتر بنانا چاہتے ہیں تو بلاواسطہ ٹیکس سے بالواسطہ ٹیکس کی طرف منتقل ہونا پڑے گا اور ہر آدمی سے اس کی استطاعت کے مطابق ٹیکس وصول کرنا ہوگا۔غیر منصفانہ ٹیکس کا نظام لمبے عرصے تک نہیں چل سکتا اور اسے ہم دیکھ بھی رہے ہیں۔حکومت کی جانب سے فراہم کردہ سروسز کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ کچھ چیزیں ریاست کی ذمہ داریوں میں آتی ہیں۔اگر کسی شہری کے پاس پیسے نہیں ہیں تو ریاست کا فرض ہے کہ وہ اس کو سہولیات فراہم کرے اور اس پر نہ ختم ہونے والی بحث ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ریاست کہتی ہے کہ ہم بہتر سہولیات اس لیے نہیں دے پاتے کیونکہ ہمارے پاس ٹیکس کی رقم نہیں پہنچتی جبکہ ٹیکس دہندگان کہتے ہیں کہ ہم ٹیکس اس لیے ادا نہیں کرتے کیونکہ حکومت بہتر سہولیات فراہم نہیں کرتی۔اس ڈیڈ لاک کو کسی نہ کسی کو توڑنا ہوگا۔ٹیکس کا نظام ان کیلئے دشوار ہے جن کو سہولیات میسر نہیں لیکن جن کو سہولیات میسر ہیں اور جن کو اس سے فائدہ در فائدہ ہوتا چلا جارہا ہے ان کیلئے یہ ایک اچھا نظام ہے۔بہت شکریہ۔

زاہد فاروق: محترم جناب محمد رضا صاحب ! آپ کا بہت شکریہ۔ آپ نے کوشش کی کہ اس مختصر دورانیے میں ٹیکس کے نظام میں جہاں جہاں زیادتی ہورہی

ہے اس کو اجاگر کیا جائے۔ دولت مند فائلرز ہوتے ہیں اس لیے ان سے کم ٹیکس لیا جاتا ہے جبکہ جو کم پیسے والے ہوتے ہیں وہ فائلر نہیں ہوتے اس لیے ان سے زیادہ ٹیکس لیا جاتا ہے۔ آج کل اسی فارمولے کے تحت کام ہو رہا ہے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ نظام میں عدل نہیں ہے جب تک اس ناانصافی کو ختم نہیں کیا جائے گا یہ سماجی ناہمواری معاشرے کو کھوکھلا کرتی رہے گی۔

عارف حسن: محمد رضا صاحب نے ٹیکسیشن کے نظام کی ایک مکمل اور بھرپور تصویر پیش کی ہے۔ انہوں نے صرف ٹیکس کا نظام پیش نہیں کیا بلکہ ہمیں بہت سی سیاسی چیزیں بھی سمجھائی ہیں۔ یہ سیاسی نظام 80 سال کی معاشی صورتحال کا مجموعہ ہے۔ ایک بہت بڑا مسئلہ یہ ہے کہ جو نظام اس طرح قائم ہوتے ہیں ان میں تبدیلی بڑی سیاسی قوتیں لے کر آتی ہیں لیکن ہمارے ملک میں تبدیلی لائی ہی نہیں جاتی۔ شاید میکرو اکنامک بہتر ہوگئی ہو مجھے اس کے بارے میں علم نہیں لیکن اگر اس سے عام آدمی کے حالات زندگی پر فرق نہیں پڑا اور اس کے حالات مزید بدتر ہو گئے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ٹیکسیشن نظام، سیاسی نظام کی بہت بڑی ناکامی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم اس کو کس طرح سے تبدیل کر سکتے ہیں۔ رضا صاحب نے کہا کہ یہ بہت خشک عنوان ہے۔ شاید یہ مضمون خشک ہو لیکن آپ نے بہت دلچسپی کے ساتھ ہمیں اس بارے میں سمجھایا ہے۔ میرے خیال میں ہم بہت سی باتیں سمجھتے تھے لیکن اس کی تفصیل سے واقف نہیں تھے۔ اس لیے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ یو آر سی اور آپ کا رشتہ قائم رہے گا اور ہم اس گفتگو کو آگے لے کر چلیں گے کیونکہ اس حوالے سے سیاسی پہلوؤں پر

گفتگو کرنا بہت ضروری ہے۔

زاہد فاروق: اب ہم اس معاشی ناہمواری کے حوالے سے بات کریں گے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ جب تک عام آدمی اور سیاسی جماعتوں کے کارکن مسائل کے حوالے سے بات نہیں کریں گے، سیاسی جماعتوں کے منشور میں اس چیز کا تذکرہ نہیں ہوگا کہ وہ کس طرح معاشی ناہمواری کو ختم کریں گے تو یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکے گا۔ یہ کسی ایک جماعت کا مسئلہ نہیں بلکہ عوام کا مسئلہ ہے۔ اسلیے اسے اجتماعی طور پر حل کرنے اور اس پر بات کرنے کی ضرورت ہے۔

مہمان: حکومت اس وقت مختلف طریقوں سے ٹیکس وصول کر رہی ہے۔ حکومت سندھ الگ ٹیکس وصول کرتی ہے جبکہ وفاق الگ ٹیکس وصول کرتا ہے۔ اس سے بزنس مین کو دو مرتبہ ٹیکس ادا کرنا پڑ رہا ہوتا ہے۔ پڑوسی ممالک میں ٹیکس بہت کم ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بہتری کی طرف جا رہے ہیں لیکن ہمیں پاکستان میں بہتری دیکھنے کو نہیں ملتی۔ ہم اتنے زیادہ خوفزدہ ہیں کہ اپنی بات اٹھانے پر بھی ہمیں ڈر محسوس ہوتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ ابھی یہاں ہم کتنے لوگ موجود ہیں اگر آپ ان سے پوچھیں کہ اگر آپ کو سہولیات بہتر طریقے سے میسر آئیں تو کیا آپ ٹیکس ادا کرنا چاہیں گے تو کوئی بھی شخص یہاں انکار نہیں کرے گا۔ ٹیکس ادا کرنے والا فائلر بننے سے ڈرتا ہے۔ جس طرح رضا صاحب نے بھی کہا کہ نوٹسز کی بھرمار ہو جاتی ہے تو اس مسئلے کو کس طرح حل کیا جا سکتا ہے۔ بہت شکریہ۔

محمد رضا: ہمارے دستور کے اندر ٹیکس کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس میں

کچھ ٹیکس وفاقی حکومت کے زمرے میں آتے ہیں جبکہ کچھ ٹیکس صوبائی اسمبلی کے تحت آتے ہیں۔ اٹھارویں ترمیم کے بعد سروسز سے متعلق تمام سیلز ٹیکس جمع کرنے کا اختیار صوبوں کے پاس ہے جبکہ انکم ٹیکس یعنی جو کچھ ہم لوگ کماتے ہیں یہ ٹیکس وفاقی حکومت کے پاس جاتا ہے۔ اشیائے خوردنوش وغیرہ پر جمع ہونے والا سیلز ٹیکس بھی وفاقی حکومت کے پاس جاتا ہے۔ کسٹمز سے جمع ہونے والا ٹیکس بھی وفاقی حکومت کو ملتا ہے۔ آپ کی بات بالکل درست ہے کہ اگر میں بطور شہری یا صارف کے طور پر دیکھوں تو سمجھ نہیں آتی کہ کون سا ٹیکس صوبائی ہے کون سا وفاقی۔ لیکن ایسا نہیں کہ ایک ٹیکس دو بار لیا جا رہا ہو۔ مثال کے طور پر اگر میں ایک موبائل خریدتا ہوں تو اس پر سیلز ٹیکس بھی لاگو ہوتا ہے اور انکم ٹیکس بھی لگتا ہے اس پر فیڈرل ایکسائیز ڈیوٹی بھی لاگو ہوتی ہے۔ پٹرولیم مصنوعات پر لیوی عائد کی جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ الجھاؤ ریاست کا اپنا پیدا کردہ ہے۔ اس کی ایک بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ این ایف سی کے بعد ریاست کے پاس کچھ بچتا ہی نہیں ہے۔ اس لیے انہوں نے کچھ ایسے طریقے نکال لیے ہیں کہ یہ پیسے وفاق کے پاس ہی رہے۔ وفاق نہیں چاہتی کہ ٹیکس کا پیسہ صوبوں کے پاس جائے۔ انہیں لگتا ہے کہ یہ پیسہ اگر صوبوں کے پاس جائے گا تو ہمارے پاس کچھ نہیں بچے گا۔ ایک بات واضح کر دوں کہ ایک ہی چیز پر متعدد ٹیکس ضرور ہو سکتے ہیں جو ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں لیکن ایک ہی ٹیکس دونوں حکومتیں وصول نہیں کر سکتیں کیونکہ ان کی الگ الگ تقسیم ہے۔ اگر سندھ حکومت کوئی ٹیکس لے رہی ہے تو اس پر وفاق ٹیکس نہیں لے سکتی اور اسی طرح اگر وفاقی حکومت کوئی ٹیکس وصول

کر رہی ہے تو صوبائی حکومت اس پر ٹیکس نہیں لے سکتی ۔کسی چیز پر سیلز ٹیکس اور انکم ٹیکس دونوں عائد ہونے کی صورت میں ٹیکس کی رقم دونوں حکومتوں کے پاس جاتی ہے لیکن ایک ہی ٹیکس دو بار نہیں لیا جاتا۔ رویے کے حوالے سے کی جو کہ بالکل درست ہے میں 1997 سے ٹیکس کی شعبے سے وابستہ ہوں۔ 2001 سے پہلے ٹیکس کا نظام بالکل مختلف طریقے کا ہوتا تھا۔جب آپ کوئی گوشوارہ داخل کرواتے تھے تو ریاست کسی کا اعتبار نہیں کرتی تھی اور ہر چیز کی خود جانچ پڑتال کرتی تھی ۔حکومتی ادارے دو سال تک آپ کے اکاؤنٹس کھنگالتے تھے اور اس کے بعد اپنے تخمینے کے مطابق ٹیکس عائد کرتے تھے۔ 2001 کے قانون میں تبدیلی کی گئی جس کے مطابق ٹیکس دہندہ جو اثاثے ظاہر کرے گا اسے ہی سچ مانا جائے گا لیکن آڈٹ کرنے کا اختیار بھی رکھا گیا۔ اگر سو لوگوں نے ٹیکس ریٹرن فائل کیا ہے تو اس میں سے پندرہ بیس لوگوں کا آڈٹ کر لیا جاتا تھا۔ 2006 تک یہ نظام بہت اچھا چلا۔اس وقت ہم ٹیکس پریکٹس میں تھے اور ہم سوچتے تھے کہ شاید ہمارا کام ختم ہو جائے گا کیونکہ اب کوئی آڈٹ نہیں ہوتا لیکن 2008 میں معاشی دشواریاں شروع ہوئیں ۔حکومت ہر وقت قحط زدہ ماحول میں رہنے لگی ۔اسلئے حکومت چاہتی تھی کہ اگر عوام بلاواسطہ ٹیکس دے رہی ہے تو اس رقم میں مزید دو روپے کا اضافہ کس طرح کیا جائے ۔کیونکہ اس طرح حکومت کی محنت کم لگتی ہے ۔ مثال کے طور پر جوڑیا بازار یا کسی منڈی میں جا کر جہاں لوگ بالکل ٹیکس ادا نہیں کرتے ان سے ٹیکس نکلوانا مشکل ہوتا ہے ۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ جو آدمی ٹیکس دے رہا ہے اس پر بوجھ بڑھتا چلا جا رہا ہے اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ حکومت کو

بلا واسطہ ٹیکس لینا آسان لگتا ہے۔لوگوں کو بھی معلوم نہیں ہوتا کہ پہلے جو چیز دس روپے کی تھی وہ گیارہ روپے کی کیوں ہوگئی؟ لوگ اس حوالے سے سوال نہیں کرتے اور آہستہ آہستہ اس اضافے کو تسلیم کر لیتے ہیں۔اس کا فرق سب سے زیادہ محدود آمدنی والے طبقے پر پڑتا ہے۔جس کے پاس محدود آمدنی ہے اس کے پاس خرچ کرنے کیلئے صرف 11 روپے ہی تھے۔اگر اس کے تمام 11 روپے آپ لے جائیں گے تو وہ اپنی تعلیم اور صحت کے اوپر کس طرح خرچ کرے گا؟ اگر وہ اپنی تعلیم پر خرچ نہیں کرے گا تو اس کے بچے اسی طرح معاشی مسائل میں الجھے رہیں گے اور محروم زدہ رہیں گے۔

رانا صادق: ہمارے ریاستی نظام میں غریب، غریب تر اور امیر، امیر ترین ہوتا چلا جا رہا ہے۔وزراء کی تنخواہیں لاکھوں میں ہیں اس پر ان کو گاڑی، پٹرول، بجلی، بیرون ملک سفر کے مواقع، میڈیکل اور دیگر سہولیات اور مراعات مفت فراہم کی جاتی ہیں۔ جبکہ کم آمدنی والے طبقے سے تعلق رکھنے والا شخص جو اپنی محدود آمدنی میں گزارا کرتا ہے اس کے لیے حکومت کوئی سہولت فراہم نہیں کرتی۔ہمارے ملک کا نظام گل سڑ چکا ہے۔جب عوام کو ریلیف دینے کی بات آتی ہے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ آئی ایم ایف ناراض ہوگا لیکن اپنی تنخواہیں ایک جھٹکے میں کئی کئی لاکھ روپے بڑھا لی جاتی ہیں۔

محمد رضا: کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ زبان اور الفاظ کا آپ کی تہذیب سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔انگریزی میں GOVERN اور RULE دو مختلف اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں لیکن اردو میں ہم صرف حکومت کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ملک میں خدمت کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔جو لوگ حکومت میں آتے

ہیں وہ خود کو حاکم سمجھنے لگتے ہیں خادم نہیں سمجھتے اور شاید ہم بھی ان لوگوں کو حاکم اور خود کو محکوم سمجھنے لگتے ہیں ۔ جب تک ریاست اور عوام کا تعلق متوازن نہیں ہوگا تب تک یہ مسائل حل نہیں ہوسکیں گے ۔

جنید: حکومت نے پیٹرولیم مصنوعات پر لیوی لگا رکھی ہے ۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیا یہ لیوی درست ہے یا نہیں؟

محمد رضا: میں نے گفتگو کے آغاز میں ذکر کیا تھا کہ وفاق کے پاس جتنے ٹیکسز جمع ہوتے ہیں وہ صوبائی حکومتوں میں تقسیم کرنے پڑتے ہیں ۔ اس لیے انہوں نے پیٹرولیم مصنوعات پر لگنے والے ٹیکس کا نام تبدیل کر کے لیوی کر دیا تا کہ حاصل شدہ ٹیکس وفاقی حکومت کے پاس جائیں اور اسے صوبوں میں تقسیم نہ کرنا پڑے ۔ پیٹرول لیوی بھی ایک ٹیکس ہی ہے جس کا نام تبدیل کر دیا گیا ہے ۔

حسان عارف: اگر ہم اس نظام کی درستگی چاہتے ہیں تو وہ کون سے اقدامات ہیں جو ہم کر سکتے ہیں ۔ جس سے ہم یہ کہہ سکیں کہ آئندہ آنے والے 10 یا 20 سالوں میں یہ نظام بہتر ہو سکے گا ۔

محمد رضا: کوئی بھی چیز انفرادی طور پر بہتر نہیں ہوسکتی ۔ جس طرح عارف صاحب نے بھی بتایا کہ یہ ایک سماجی اور سیاسی عمل ہے ۔ اس حوالے سے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اگر آج میں یہ ایک چیز کروں گا تو اس سے کچھ درست ہو جائے گا ۔ آج کی اس گفتگو اور فورم کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں میں آگاہی پیدا ہو اور ہمیں معلوم ہو کہ بطور شہری ہمارے کیا حقوق اور فرائض ہیں ۔ اگر حکومت اپنے فرائض احسن طریقے سے نہیں نبھا رہی تو ہم

اس کے خلاف آواز اٹھا سکیں۔ اگر حکومت ہم سے ٹیکس وصول کر رہی ہے اور ہمارے گلی محلے کے مسائل حل نہیں ہوتے تو ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہمیں اپنے مسائل کے حل کے لیے کہاں جا کر کس سے بات کرنی ہے۔

عبدالقدیر: ہمارے نظام میں بہت سی خرابیاں ہیں۔ وفاق اور صوبائی حکومت کی کھینچا تانی میں ہمیشہ عوام پستی ہے۔ بجلی، گیس، پٹرول غرضکہ ہر چیز پر ٹیکس عائد ہے۔ مہنگی بجلی اور گیس کے باعث لوگ کاروبار نہیں کر پا رہے۔ مہنگے پٹرول کے باعث ٹرانسپورٹرز پریشان ہیں۔ غریب طبقہ پریشانی کے عالم میں ہے۔ جب تک سیاسی پارٹیاں اور حکومت آپس میں مل بیٹھ کر اس مسئلے کے حل کیلئے کام نہیں کریں گی تب تک یہ مسئلہ حل ہونا ممکن نہیں۔

افشاں: میں جاننا چاہتی ہوں کہ ٹیکس ریٹرن فائل کرنے میں اتنے مسائل کیوں پیدا کیے جاتے ہیں؟ جب ٹیکس گوشوارے داخل کرانے جاؤ تو لاتعداد سرٹیفکٹس مانگے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ود ہولڈنگ ٹیکس کے بارے میں بھی بتائیں کہ یہ کیا ہوتا ہے۔

محمد رضا: 2001 میں جب ایف بی آر کی جانب سے خود احتسابی کا نظام متعارف کروایا گیا تھا اور عوام پر اعتماد کیا گیا تھا تو لوگوں نے چوریاں کرنا شروع کر دی تھیں۔ جب آڈٹ ہوا اور لوگوں کی چوریاں پکڑی گئیں تو یہ ہوا کہ جس طرح گیہوں کے ساتھ گھن پستا ہے ان کے خلاف ایکشن لینے کے بجائے تمام لوگوں کے معاملات کو ایک ہی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب ٹیکنالوجی کا بہتر استعمال کیا جا رہا ہے۔ اگر آپ

اس بار ٹیکس ریٹرن دیکھیں تو اس میں آپ کا بہت سارا ڈیٹا پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ سرسید یونیورسٹی میں آپ کی سیلری پر جو ٹیکس کٹتا ہے وہ آپ کے پاس لکھا ہوا آجائے گا۔ اس کے علاوہ ٹیکس ریٹرن داخل کرتے ہوئے آپ کو کسی قسم کے کاغذات جمع نہیں کرانے پڑتے۔

ود ہولڈنگ ٹیکس آپ کی آمدن کے اوپر لگنے والے ٹیکس کی سہولت ہے۔ ایف بی آر نے تنخواہ دار طبقے کیلئے یہ سہولت متعارف کروائی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر تنخواہ دار آدمی کو سال کے آخر میں ٹیکس ادائیگی کا کہا جائے تو اس کیلئے اکھٹی رقم نکالنا ممکن نہیں ہوگا۔ اسلئے ایف بی آر تنخواہ کے حساب سے تخمینہ لگاتا ہے اور ہر ماہ سیلری میں سے ٹیکس کاٹ لیا جاتا ہے۔ یہ نظام دنیا بھر میں رائج ہے کیونکہ اگر سال کے آخر میں آپ سے یہ کہا جائے کہ ایک لاکھ روپے ٹیکس ادا کرنا ہے تو یہ مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لیے حکومت کمپنی مالکان کی ذمہ داری لگاتی ہے کہ وہ سیلری دیتے ہوئے جو ٹیکس بنتا ہے وہ کاٹ لیں تاکہ وہ سرکار کے پاس جمع ہو جائے۔ دنیا بھر میں ود ہولڈنگ ٹیکس صرف سیلری یا بیرون ممالک کی جانے والی ادائیگیوں پر ہوتا ہے لیکن بدقسمتی سے پاکستان میں ہر چیز پر ود ہولڈنگ ٹیکس عائد کر دیا گیا ہے۔ جس طرح موبائل فونز پر اس لیے ٹیکس لگایا گیا ہے کہ آدھے لوگ اس کی واپسی کا مطالبہ ہی نہیں کرتے تو حکومت کو ایک طرح سے مفت کا پیسہ مل رہا ہے۔ اگر ایک آدمی جس کی سالانہ چھ لاکھ روپے تنخواہ ہی نہیں ہے لیکن اس کے پاس موبائل موجود ہے اور وہ ریٹرن فائل نہیں کر رہا تو حکومت کو یہ رقم واپس نہیں کرنی پڑتی۔

اظہر جمیل (کنسرن سٹیزن الائنس): ہم مسائل کے حوالے سے تو بہت زیادہ بات کرتے ہیں لیکن ان مسائل کے حل پر بات نہیں کی جاتی۔ اگر ٹیکس کا نظام درست نہیں کیا جائے گا تو معاشرہ انتشار کی جانب بڑھتا جائے گا جسے کوئی سیاست دان یا سیاسی پارٹی نہیں بچا سکے گی۔ 2018 میں ایک پاکستانی نژاد برطانوی نے دعویٰ کیا تھا کہ اگر ہم اپنے نظام کو ڈیجیٹائز کریں تو دو سے تین سال میں ٹیکس ریٹرن 11 فیصد سے 22 فیصد تک لے جا سکتے ہیں۔ لیکن اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی یہ ممکن نہیں ہو سکا۔ ہم اس حوالے سے ایک سیشن منعقد کریں گے جس میں اس مسئلے کے حل کے حوالے سے بات کی جائے گی۔ میرا تعلق کنسرن سٹیزن الائنس سے ہے۔ ہمارے پاس کراچی سے ہر قسم کے ایکسپرٹس موجود ہیں جو ان مسائل کے حل پیش کر سکتے ہیں۔ ہم یہ تجاویز حکومت کے پاس لے کر جائیں گے۔ ہمیں اپنے مسئلے حل کرنے کے لیے خود متحرک ہونا پڑے گا۔ چند روز قبل میں ٹی وی پر ایک 15 سے 20 سال پرانا پروگرام دیکھ رہا تھا۔ جہاں معراج محمد خان کا انٹرویو چل رہا تھا۔ انہوں نے کہا کہ جو لوگ ٹیکس ادا نہیں کرتے ان کو جیلوں میں بند کرنا چاہیے اور وہ سب سے امیر ترین طبقے، وڈیرے اور سرمایہ داروں کے حوالے سے بات کر رہے تھے کیونکہ حکومت نے ان امیر ترین طبقات کو چھوٹ دے رکھی ہے۔ جبکہ کم آمدنی والا طبقہ ذریعہ معاش نہ ہونے اور ٹیکسز کی بھرمار کی وجہ سے پریشان ہے۔ اسی وجہ سے چوری اور ڈکیتی کی وارداتوں میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

مہمان: جب تک پارلیمان میں بیٹھے وزراء کا احتساب نہیں ہوگا تب تک ٹیکس

نظام، عدالتی نظام اور سیاسی نظام درست نہیں ہو سکتے۔ اگر اداروں کے اندر توازن نہ ہو تو یہ مسائل بڑھتے جائیں گے۔ ہمارے ملک میں صحافت آزاد نہیں رہی۔ صحافیوں اور چینلز پر بہت سے پابندیاں لگا دی گئی ہیں۔ ہماری عدلیہ بھی آزاد نہیں ہے جبکہ بہت سے مسائل اٹھارویں ترمیم سے جڑے ہوئے ہیں۔

زاہد فاروق: ہمارے ملک میں سیاسی ناہمواری ہے جسے ہم ہمیشہ تسلیم کرتے ہیں لیکن معاشی ناہمواری پر بات نہیں کی جاتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اسے بھی تسلیم کرنا چاہیئے۔

محمد رضا: اگر میں اس مسئلے کے حل پر بات کروں تو حکومت کی جانب سے ڈیجیٹلائزیشن پر بہت کام ہوا ہے۔ پچھلے سال ادارہ شماریات نے پہلی بار ایک معاشی سروے جاری کیا جس کا مقصد یہ دیکھنا تھا کہ ٹیکس تو تمام لوگ ہی ادا کر رہے ہیں لیکن کتنے لوگ ہیں جن کو حقیقتاً ٹیکس ادا کرنا ہوتا ہے۔ آپ نے بالکل درست کہا کہ ڈیجیٹلائزیشن پر 10 سال پہلے کام ہونا چاہیے تھا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اب ان کی اس طرف توجہ ہے اور اس بار کے ریٹرنز دیکھ کر ہمیں بھی اندازہ ہو رہا ہے کہ اس حوالے سے بہتر کام ہو رہا ہے۔ اگر ہم اس مسئلے کا حل تلاش کریں تو یہ بہت آسان ہے۔ اس کا سب سے بہترین حل دستاویزات کی فراہمی ہے۔ اگر آپ معیشت کو دستاویزی بنیادوں پر چلائیں گے اور ٹرانزیکشنز کا ڈیٹا موجود ہوگا تو ٹیکس وصولی کے نظام میں بہتری آئے گی لیکن اگر کسی شخص کی آمدن اور اثاثے معلوم ہی نہیں ہوں گے تو یہ معلوم نہیں ہو سکے گا کہ اس سے کتنا ٹیکس وصول کرنا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اختیارات کی منتقلی کے ساتھ ٹیکسز کی

منتقلی کی بھی ضرورت ہے۔ دنیا میں ٹاؤن کونسلز لوگوں کے روزمرہ کے مسائل حل کرتی ہیں ٹیکس کا پیسہ ان کے پاس جاتا ہے جس کی وجہ سے شہری اپنے مسائل کے حل کے حوالے سے ان کونسلز سے سوال کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر ٹیکس کسی اور کے پاس جا رہا ہے اور کام بھی نہیں ہو رہا تو مجھے سمجھ نہیں آئے گا کہ میں کس سے سوال کروں اور کس سے شکایت کروں۔

زاہد فاروق: فورم کے آخر میں، میں عارف حسن صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ آج ہونے والی گفتگو کے حوالے سے اپنی رائے دیں۔

عارف حسن: رضا صاحب نے اعداد و شمار کے حوالے سے ایک بہت خوفناک سی تصویر پیش کی ہے۔ ایک جانب ہم قرضوں میں ڈوبے ہوئے ہیں اور سوچتے ہیں کہ یہ قرضے اتارنے کیلئے ہمارے پاس رقم کہاں سے آئے گی جبکہ دوسری جانب ہم دیکھتے ہیں ہمارے اخراجات اتنے زیادہ ہیں کہ وہ قرضوں کے بغیر چل نہیں سکتے۔ آپ نے جو گفتگو کی اس میں سے بہت سی باتیں مجھے معلوم بھی نہیں تھیں۔ ان چیزوں کو دیکھ کر یہ سامنے آتا ہے کہ آپ کے قرضے اسی طرح بڑھتے جائیں گے اور یہ کبھی کم نہیں ہو سکیں گے۔ اور اگر آپ کے قرضے بڑھتے جائیں گے تو پھر آپ پر ٹیکس بھی بڑھتے جائیں گے۔ سوال یہ ہے کہ آپ اس کو قابو کس طرح کریں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ کی ریاست جیسی ہوگی ٹیکس کا نظام بھی ویسا ہی ہوگا اور ریاست ہم سب کے سامنے ہے۔ بلا ضرورت بڑی بڑی گاڑیاں امپورٹ کی جاتی ہیں۔ حکومتی وزراء اور اعلیٰ عہدیداران کی تنخواہیں 20 سے 30 لاکھ روپے تک ہوتی ہیں۔ ایک خاص طبقے کی

پنشنز میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے جبکہ دوسرے طبقے کیلئے کسی قسم کی کوئی پینشنز یا مراعات ہی نہیں ہیں۔آپ کے ایلیٹس کے اخراجات ایک طرف جبکہ باقی طبقات کی اخراجات ایک طرف ہیں۔میں سمجھتا ہوں کہ اس کا کوئی آپس میں میل نہیں ہے۔ یہ فرق اتنا زیادہ اور اتنا بڑا ہوتا جارہا ہے کہ اس کو کم کرنا بھی اب ناممکن لگنے لگا ہے۔افسوس اس بات کا ہے کہ ریاست انہی لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔جب اظہر صاحب اپنا انقلاب لائیں گے تو شاید اس کے ذریعے تبدیلی آجائے۔میں نے ابھی جن باتوں کا ذکر کیا ہے یہ بہت اہم ہیں اور ان کو مدنظر رکھنا اور سمجھنا ضروری ہے۔میں محمد رضا صاحب کا بہت زیادہ مشکور ہوں جنہوں نے ہمیں اتنی اہم باتیں بتائیں۔اب یہ ہمارا کام ہے کہ ہم ان باتوں کو سمجھ کر اس پر غور کریں اور ان کا مطلب اخذ کریں۔ان باتوں پر ہم نعرے بازی تو کر سکتے ہیں لیکن اگر اسے سنجیدگی سے دیکھنا ہے تو اسے ملکی سیاست کے ساتھ جوڑ کر دیکھنا پڑے گا۔مجھے معلوم ہے کہ ہمارے پاس بہت سے ایسے لوگ ہیں جو یہ کر سکتے ہیں۔رضا صاحب ہم آپ کو ایک بار پھر مدعو کریں گے تاکہ آپ ہمیں تفصیلاً اس حوالے سے مزید اچھی باتیں سمجھا سکیں۔

زاہد فاروق: آپ تمام خواتین وحضرات کا آج کے فورم میں شرکت کرنے پر بہت شکریہ۔آپ لوگ شہر میں ٹرانسپورٹ کے مسئلے کو جھیلتے ہوئے ان سڑکوں پر سفر کر کے مشکل حالات کے باوجود یہاں آئے۔ہمارے ساتھ چائے نوش کریں۔

☆-------☆-------☆

Taxes: Sahoolat Ka husool ya Dushwar Zindagi

URBAN RESOURCE CENTRE (URC) FORUM SERIES

29 September 2026

By: Muhammad Raza, FCA

Fairer taxation + accountable institutions + visible public value = sahoolat

Today's discussion

Three questions connect tax design, public delivery and trust

1 WHO PAYS—AND HOW FAIRLY?

- Where we pay tax in everyday life
- Why taxation is connected to citizenship
- The State's less visible public value
- Is the burden shared fairly?

2 WHERE DOES THE MONEY GO?

- When citizens pay twice
- Follow Rs100: distribution + federal spending
- From collection to Karachi's street
- What reaches Karachi—and who delivers?

3 WHAT VALUE RETURNS?

- Fairness between different parts of Pakistan
- Human development as the real return on public funding
- A new fiscal compact
- Conclusion: rebuilding trust

How many times did you pay tax today?

Filing a return is not the same as bearing tax.

Rs 100
tax-inclusive price at 18%

Rs 15.25
is the tax inside that price — not Rs 18

The burden is heavier for lower-income households.

- On phone and electricity bills, taxes may appear as charges.
- On fuel, food and services, taxes or duties can sit inside the price.
- Taxes can raise final prices—but inflation has multiple causes.
- Together they squeeze households with the least room to adjust.

Where might you already have paid tax today without noticing it?

Taxation as citizenship and shared institutions

A city works because strangers depend on shared systems.

FROM CITY LIFE

- A city is a network of interdependence
- Shared needs require shared institutions
- Every view of State still needs financing

→

resources create capacity

TO PUBLIC VALUE

- Institutions need sustainable resources
- Taxation finances civic life
- Public value gives taxation legitimacy

Shehr. Shehri. Shared institutions.

The State's less visible public value

Institutions can protect daily life even when we do not use them directly.

VISIBLE SERVICES

- Roads and public transport
- Schools and learning
- Clinics and hospitals
- Water, sanitation and drainage

FOUNDATIONS IN THE BACKGROUND

- Security creates space for ordinary life
- Courts make constitutional rights and contracts enforceable
- Property, identity and records support participation
- Financial stability protects saving, credit and exchange

Which public institution do we notice mainly when it fails?

Is the burden shared fairly?

Similar capacity should mean a broadly comparable burden.

1	**Comparable burden**	People with similar economic capacity should not carry radically different burdens.
2	**Visibility**	Formality and documentation should not become a disadvantage.
3	**Total burden**	Tax payable is only one part; time, uncertainty, records and disputes also cost.
4	**Respectful compliance**	Rules should be clear, predictable, simple—and provide a reliable remedy.

Technology should serve the citizen—not merely monitor the citizen.

When citizens pay twice

Contributing collectively. Surviving privately.

TAXES PAID + **school fees • clinic bills • tanker water**
generator power • private security = **A SECOND HOUSEHOLD BILL**

Citizens often pay twice for essential needs.

Private alternatives can hide public failure.

Purchasing power must not determine effective citizenship.

The issue is a reasonable public minimum—not an equal personal return for every rupee.

Where Rs100 of divisible-pool taxes goes

First split the tax pool; Sindh's share sits inside the provincial share—not beside it.

ONE DENOMINATOR: Rs100 OF DIVISIBLE-POOL TAXES



FEDERATION RETAINS ≈ Rs42

PROVINCES RECEIVE ≈ Rs58

WITHIN THE PROVINCIAL SHARE

Rs14.5 is Sindh's approximate share of the same national Rs100

Rs58 + Rs42 = Rs100. Sindh's Rs14.5 sits inside the Rs58.

This slide shows tax distribution only; it does not show the federal expenditure budget.

How the Federation finances and spends its budget

A separate Rs100: total federal expenditure—not Rs100 of divisible-pool taxes.

WHAT FINANCES THIS Rs100

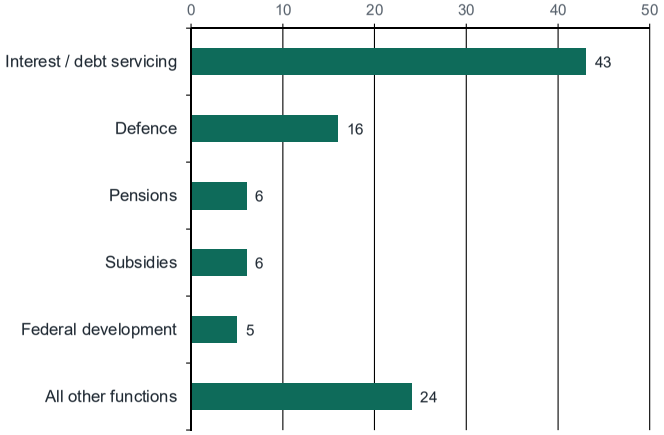
1. **Retained federal taxes**
   the federal share after transfers

2. **Non-tax revenue**
   such as receipts, profits and fees

3. **Borrowing / deficit financing**
   used when spending exceeds revenue

Retained revenue ≠ total spending.
Borrowing finances the gap.

FROM Rs100 OF TOTAL FEDERAL EXPENDITURE



DIFFERENT DENOMINATOR: do not add this expenditure Rs100 to the Rs58 provincial transfer.

From federal collection to the street

Money and authority must travel with responsibility.

1	**Federal collection**	Major federal taxes enter the common pool.
↓		
2	**NFC distribution**	The Federation and provinces share divisible-pool taxes.
↓		
3	**Provincial allocation**	Sindh combines transfers with its own revenue and priorities.
↓		
4	**Local transfer**	PFC and local grants should be transparent and predictable.
↓		
5	**Neighbourhood service**	Resources, authority and accountability meet at street level.

Provincial spending in Karachi is not the same as local devolution.

How much of Sindh's spending reaches Karachi?

There is no single budget line: three flows must be counted without double counting.

1 PROVINCE-WIDE BY FUNCTION

Sindh's pooled budget

Education + health
Public safety + policing
Water + transport + infrastructure
Pensions, debt costs + administration

Usually published by function—not reconciled by city.

2 SPENT IN KARACHI

Federal & Provincial activity in the city

Karachi-specific development projects
KWSC, SSWMB + mass transit
Provincial schools, hospitals + policing

Spending in Karachi—but not necessarily devolved.

3 DEVOLVED LOCALLY

Funds controlled by local institutions

PFC / formula transfers
Grants to KMC
Transfers to 25 TMCs
Resources for 246 UCs

The clearest measure of local fiscal autonomy.

KARACHI FISCAL FOOTPRINT = provincial services + Karachi projects + local transfers − overlaps

Without a published geographic reconciliation, no single defensible Karachi percentage exists.

Karachi: service delivery + financing + governance

Karachi is one city—but not one integrated system.

ONE CITY • MANY AUTHORITIES

KMC + 25 TMCs + 246 UCs

alongside 7 districts, 6 cantonment boards, port bodies and other land agencies

One institution collects; another allocates; another delivers. Responsibility needs authority, resources and accountability.

Citizens need to know who is responsible.

WHO HANDLES WHAT?

Water & sewerage	KWSC
Solid waste	SSWMB + local bodies
Police & much mass transit	Sindh government agencies
Roads, drains, lights & parks	KMC / TMCs / cantonments—depending on location
Building control	SBCA + special jurisdictions

Justice across Pakistan

Fairness must recognise different—but equally legitimate—forms of need.

RURAL & REMOTE DEPRIVATION

Missing basic schools, healthcare, clean water, sanitation and connectivity

FAIRNESS

METROPOLITAN SERVICE BURDEN

Population, density, commuters, migrants, ports and infrastructure pressure

Redistribution is part of citizenship and federalism—not a contest between places.

Need • population • cost of delivery • urban pressure • revenue effort • performance

What public minimum would we demand if we did not know our income, class, city or province?

Human development is the real return

Infrastructure is a means; the outcome is what people can actually do and become.

FOLLOW THE RESULTS CHAIN

1. **ALLOCATION** — what is promised
2. **RELEASE** — what is made available
3. **EXPENDITURE** — what is actually used
4. **SERVICE** — what functions for people
5. **OUTCOME** — what changes in life

A SCHOOL MATTERS

when children learn

A HOSPITAL MATTERS

when treatment is accessible

A ROAD MATTERS

when it connects people to opportunity

Govern beyond the five-year electoral horizon: build capability for the next generation.

A new fiscal compact

Fairer taxation and accountable institutions must proceed together.

FIVE CONNECTED COMMITMENTS

1 PUBLIC MINIMUM

Education, primary health, water, sanitation, connectivity, mobility and safety

2 HUMAN OUTCOMES

Measure what changed—not only what was spent or built

3 TRANSPARENT DISTRIBUTION

Show how resources move and why each institution receives them

4 REAL DEVOLUTION

Match responsibility with money and decision-making authority

5 FAIRER TAX SYSTEM

Broaden direct taxation, reduce reliance on taxing consumption, simplify compliance and improve taxpayer service

Fair taxation without visible public value cannot rebuild trust. Public responsibility without resources cannot deliver it.

Conclusion: Fairer taxation and visible public value can rebuild trust

The causal chain—and the way forward

01 **INDIRECT-TAX RELIANCE**
Raises household costs and places a heavier burden on lower-income families.

02 **WEAK & FRAGMENTED INSTITUTIONS**
Fail to turn citizens' contributions into reliable services and visible public value.

03 **CITIZENS PAY TWICE**
Private substitutes deepen inequality—and a weak public return erodes trust.

04 **THE WAY FORWARD**
A fairer revenue base, accountable institutions and real devolution reconnect tax with value.

Fairer taxation + accountable institutions + visible public value = sahoolat

عالمی حالات اور بڑھتی ہوئی مہنگائی
ایک فکری جائزہ

مقررین: عارف گرور، عارف حسن

جون 2026ء
F-144-67

اربن ریسورس سینٹر

ٹریفک کے نئے قوانین
اور عملدرآمد کا طریقہ کار

مقررین: سید ذوالفقار، عارف حسن

مئی 2026ء
F-144-65

اربن ریسورس سینٹر

شہری منصوبہ بندی اور حفاظتی اقدامات
ایک جائزہ

مقررین: نعیم احمد صادق، عارف حسن

مئی 2026ء
F-144-66

اربن ریسورس سینٹر

یو آر سی فورم سیریز



یو آر سی ملکی اور بین الاقوامی ترقیاتی منصوبوں کے مسائل پر کام کرنے والے ممتاز ماہرین کے لیکچرز کا اہتمام کرتا ہے جن کے بنیادی سطح پر مسائل کے حل پر کام کرنے والے کارکنان، این جی اوز کے نمائندے سرکاری اداروں سے وابستہ اہلکار میڈیا یا تعلیمی اداروں سے وابستہ افراد اور متعلقہ لوگ شرکت کرتے ہیں۔ یہ فورم تنظیمی اور انفرادی سطح پر کام کرنے والوں کو موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ اپنے کام کا وسیع قومی اور بین الاقوامی معاملات سے موازنہ کر سکتے ہیں۔ یہ لیکچر ان تحریکوں کے لئے کام کرنے والوں کو معلومات فراہم کرتے ہیں جو پاکستان اور خصوصی طور پر کراچی میں منصفانہ اور ایسی حکمت عملیوں کے وضع کرنے کے لئے چلائی جا رہی ہیں جن کا مقصد صرف عوامی ترقی ہو۔

''ٹیکس: سہولیات کا حصول یا دشوار زندگی''

کے عنوان سے یہ فورم 29 ستمبر 2026ء کو یو آر سی میں منعقد ہوا۔